حصہ (دوم)

سوال نمبر 2 (الف) (i). تعلیم کا دوسرا دور عجب دلچسپیوں سے بھرا ہوا تھا

دریائے سندھ کے کنارے تک اسلام حکومت کر رہا تھا۔ سیکڑوں قبیلے

ریگستان عرب سے نکل کر دور دراز ملکوں میں آباد ہوتے جاتے

تھے۔ بہت سی قومیں دلی ذوق سے اسلام کے حلقے میں داخل

ہو رہی تھیں لیکن اب تک اس وسیع دنیا میں سلطنت کی

طرف سے نہ کوئی سررشتۂ تعلیم تھا نہ یونیورسٹیاں تھیں نہ

مدرسے تھے۔

سوال نمبر 2 (الف) (ii) مذکورہ دور میں تعلیم کی سرپرستی میں حکومت کا کوئی خاص کردار اس لیے نظر آتا کیونکہ اس وقت نہ کوئی یونیورسٹی ایسی نہ کوئی مدرسہ جو حکومت نے علم کے فروغ کے لیے کھولا ہو۔ عرب کی نسلیں حکمران تھیں مگر حکومت ایسی بے تعلق اور اوپری تھی کہ ملک کے عام اخلاق، معاشرت، تمدن پر فاتح قوم کی تہذیب کا اثر بہت کم پڑ سکا۔

سوال نمبر 2 (الف) (iii) اس دور میں تمام علوم پر عربی زبان کی مہر لگی تھی۔
لیکن پھر بھی علوم و فنون بہت تیزی اور وسعت سے بڑھے
مرو، ہرات، نیشاپور، بخارا، فارس، بغداد، مصر، شام
اندلس کا ایک ایک شہر بلکہ ایک ایک گاؤں علمی
صداؤں سے گونج اٹھا تھا۔

سوال نمبر 2 (الف) (iv) عام تعلیم کی تحصیل کے لیے ہزاروں مکتب قائم ہوئے جن میں سلطنت کا کچھ حصہ نہ تھا اور وہ آج کل کے تحصیلی مدارس سے زیادہ مفید اور فیاض (ہیں) تھے - اوسط اور اعلیٰ تعلیم کے لیے مسجدوں کے صحن، خانقاہوں کے حجرے علما کے ذاتی مکانات تھے لیکن ان سادہ اور بے تکلف عمارتوں میں جس وسعت اور فیاضی سے علم کی تربیت ہوتی تھی بڑے بڑے عالی شان قصر و ایوان میں بھی جو پانچویں صدی کے آغاز میں اس غرض سے تعمیر ہوئے، اس سے کچھ زیادہ نہ ہو سکی۔

سوال نمبر 2 (الف) (۷)

تلخیص:

اس عبارت میں دورِ دوم میں تعلیم کی ترویج و اشاعت کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ اگرچہ حکومتِ وقت کی طرف کوئی معقول انتظام نہ تھا لیکن لوگوں کے ذوق اور علما کی خدمتوں سے مسجدوں کے صحنوں علما کے مکانات اور بہت سی بے تکلف جگہوں پر بھی تعلیم کی ایسی ترویج ہوئی اور علم ایسے پھیلا کہ اس کی مثال نہیں۔

سوال نمبر 2 (الف) (vi)

سوال نمبر 2(ب) (i) اختر شیرانی نے اس بند میں وطن کے نوجوانوں کو ترغیب کی ہے کہ اے نوجوانو تم قوم کا فخر ہو اور تم ہی اس کے محافظ و نگہدار بھی ہو لہذا اپنی تلواریں اٹھاؤ اور ساری عمر لٹا دو وطن کی دفاع میں یہاں تک کہ اگر نوبت آئے تو وطن کے پاک نام پر اپنی جان تک وار دو کہ یہی تمھاری معراج ہے۔ ہمیشہ شجاع کا مظاہرہ کرتے ہوئے آگے بڑھو اور دشمن کی صفوں میں گھس کر انہیں مارو۔ بقول اقبال

؎ یقیں محکم عمل پیہم محبت فاتحِ عالم جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

سوال نمبر 2(ب) (ii) **مرکزی خیال**: اے نوجوانوں اپنی تیز تلوار کے نیچے کسی کو پناہ نہ دو اور کوئی رحم نہ کرو اور وقت کی خاطر اپنی تمام عمر اور جان تک نثار کر ڈالو اور دلیری سے دشمن کی جماعتوں میں گھس کر انہیں ناکوں چنے چبوا دو۔

سوال نمبر 2(ب) (iii) یہ شعر اس نظم کے ہر بند کے آخر میں استعمال کیا گیا ہے۔ اس شعر میں شاعر مجاہدینِ اسلام یعنی وطن کے سپاہیوں کو دلیری کا درس دیتے ہیں کہ اپنی تیز دھار تلوار لیے دشمن کے لشکروں میں گھس جاؤ اور وہاں دشمن کے لیے قیامت خیز منظر بنا ڈالو یعنی کسی صورت پیچھے ہٹنے کی گنجائش نہیں۔ وطن کا دفاع تمھاری اولین ترجیح ہونی چاہیے۔

؎ ہم لائے ہیں طوفان سے کشتی نکال کر
اس ملک کو رکھنا میرے بچوں سنبھال کر

حصہ (دوئم)

سوال نمبر 2 (ج) (i) عشق میں جیت اور ہار کو ایک مقام اس لیے دیا جاتا ہے کیونکہ عشق محض زبان کے دعوے سے ثابت نہیں ہوتا۔ عشق کے لیے ضروری کہ انسان اپنا سب کچھ اپنے محبوب کے لیے لٹا دے۔ عشق کی بازی میں انسان کی اپنی رائے یا مرضی کی کوئی کارفرمائی نہیں بلکہ عشق تو خود کو مکمل طور محبوب کے سپرد کر دینے کا نام ہے اس لیے شاعر کہتے ہیں اے محب اگر تمھیں سچا عشق ہے تو ہر قسم کے حالات اور مشکلات کا سامنا کرنے کو تیار ہو جاؤ۔ محبوب کا قرب حاصل کرنے کے لیے ہر چیز کر ڈالو۔ پھر اگر جیت گئے تو واہ نیارے اور اگر ہار گئے تو تمھارا عشق سچا تو ثابت ہو جائے گا۔

؎ عشق کی اک جست نے طے کر دیا قصہ تمام اس زمین و آسماں کو بے کراں سمجھا تھا میں

سوال نمبر 2(ج) (ii) ہجر کے ایام محب کے لیے سب سے زیادہ تکلیف دہ ہوتے ہیں کیونکہ ایک محب اپنے محبوب کے بغیر دن رات گزارتا ہے۔ اس کے دماغ پر ہر وقت محبوب کا خیال حاوی رہتا ہے اور اس کی روز کی یہ آرزو ہوتی ہے کہ آج تو محبوب کا دیدار اور وصل کی ایک گھڑی نصیب ہو۔ اس شعر میں بھی شاعر یہی کہتے ہیں کہ محبوب کی بے رخی اور کج ادائی نے ہمیں پتھر دل کر دیا۔ اگرچہ محبوب کی یاد اسے ہر وقت اور ہر لمحہ ستاتی ہے لیکن اس پر محبوب کے مظالم اور ہجر کی گھڑیوں نے بھی اس کے دل کو پتھر کا کر دیا۔ اس درد نے اسے اتنا ستایا کہ اب وہ بے حس ہو چکا ہے۔ اس کے آس پاس کیا چل رہا ہے اسے اس بات کی نہ فکر ہے نہ ہوش۔

سوال نمبر 2(د) (i) **امدادی فعل**: کوئی ایسا لفظ جو فعل کے ساتھ آ کر اس کے معانی میں تبدیلی لاتا ہو۔

الف۔ اس جملے میں اصل فعل کر اور امدادی فعل دی ہے۔

ب۔ اس جملے میں اصل فعل ہوا اور امدادی فعل چاہیئے ہے۔

ج۔ اس جملے میں اصل فعل چلا اور امدادی فعل گیا ہے۔

سوال نمبر 2(د) (ii)

مطلع: کسی بھی نظم یا غزل کی قسم کے پہلے شعر کو مطلع کہتے ہیں۔ غزل میں پہلے دو اشعار کو مطلع اول اور مطلع ثانی بھی کہا جاتا ہے۔ مثلاً

آ کے پتھر تو مرے صحن میں دو چار گرے
جتنے اس پیڑ کے پھل تھے پسِ دیوار گرے

یہ شعر شکیب جلالی کی غزل کا مطلع ہے۔

کون کہتا ہے موت آئی تو مر جاؤں گا
میں تو دریا ہوں سمندر میں اتر جاؤں گا

مطلع نظموں کی اقسام جیسے مثنوی وغیرہ میں بھی استعمال ہوتے ہیں۔

اقتباس کی تشریح

اختر اور منظور ۔۔۔۔۔ بستر کو بھی شروع کر دے۔

تشریح طلب اقتباس میں مصنف دو لوگوں کا ذکر کر کے ایک بہت ہی اہم پیغام دے جاتے ہیں۔ اختر ایک ایسا شخص ہے جس نے اپنی پوری زندگی انتہائی ناہموار راستوں پر گزاری۔ پوری زندگی مختلف رنج والم برداشت کرنے پڑے اور اب کسی ٹریفک حادثے کے باعث ہسپتال میں زخمی پڑا ہے۔ اور پھر ایک ہے منظور ایک ننھی سی جان جسے کوئی جان لیوا مرض لاحق ہے لیکن وہ پھر بھی زندگی کو پوری طرح ~~جیتا ہے~~ جینے کا خواہاں ہے۔ وہ ہسپتال میں ایک ایک مریض کے پاس جا کر ان کا حال احوال پوچھتا ہے ان کو دلاسا دیتا ہے کہ وہ جلد صحت یابی کی طرف آئیں گے۔ گویا وہ ہسپتال کے وارڈ کی رونق ہوتا ہے۔ جبکہ زندگی سے بیزار درد میں ڈوبا اختر جب ہسپتال میں پڑا ہوتا ہے تو منظور اوروں کی طرح اس کے پاس بھی آتا ہے۔ حال احوال دریافت کرتا ہے اور صحت یابی کی دعا کرتا ہے۔ پہلے چند دن تو اختر اس سے زیادہ بات چیت نہیں کرتا لیکن جب اس چھوٹے سے بچے کی خوشی و مسرت دیکھتا ہے تو وہ بھی سوچنے پر مجبور

سوال نمبر 3 (صفحہ نمبر 2) ہو جاتا ہے کہ زندگی تو اس بچے کی بھی کچھ خاص نہیں لیکن یہ بھی تو کم از کم خود کو خوش رکھ رہا اور زندہ رہنے کی امید تو ہے اس میں۔ پھر اسی طرح ان دونوں کی دوستی گہری ہو جاتی ہے۔ اختر پہلی دفاع زندگی میں کسی سے بات کر کے خوشی و سکون محسوس کرتا ہے۔ منظور نے اس کے خیالات کو یکسر تبدیل کر دیا۔ پہلے جو وہ زندگی سے بیزار جینے کی تمنا بھی نہ رکھتا تھا اب وہ آہستہ آہستہ زندگی کی جانب لوٹ رہا تھا۔ سچ بات ہے کہ زندگی جب بہت زیادہ غم دکھائے تو ایک وقت پر جینے کی آرزو ہی ختم ہو جاتی ہے۔ بقول شاعر

ع زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے
ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے

پھر ایک چھوٹے سے بچے نے اختر پر ایسا اثر کر دیا کہ اب وہ اپنے سارے غم ساری رنجشیں فراموش کر کے دوبارہ زندگی کی طرف جانا تھا چاہتا تھا۔ گویا اختر کو منظور کی وجہ سے ایک دوسری زندگی مل گئی۔ وہ چاہتا تھا کہ جلد از جلد صحت یاب ہو کر ہسپتال سے رخصت ہو اور دکھوں سے پاک زندگی گزارے اس میں جینے کی ایک نئی کرن پیدا ہو گئی۔ گویا ایک ننھے سے بچے نے اختر جیسے آدمی کو جو مکمل طور پر مایوس ہو چکا تھا اسے زندگی کی اہمیت سے روشناس کرایا۔ اس سے معلوم ہوتا کہ بعض اوقات زندگی میں ایک چھوٹی یا معمولی سی چیز بھی آپ کو پوری زندگی جینے کا مقصد سکھلا جاتی ہے۔

حصہ (سوئم)

سوال نمبر 4 (صفحہ نمبر 1)

نظم کی تشریح:-

تشریح:

تشریح طلب بند جوش ملیح آبادی کی تحریر کردہ نظم جلوۂ سحر سے مقتبس شدہ ہے۔ اس بند میں شاعر اس نظم میں شاعر نے انتہائی منفرد انداز میں صبح کے دلکش اور روح پرور منظر کی تصویر کشی کی ہے۔ حقیقتاً صبح کا منظر اس قدر دلفریب اور دلکش ہوتا ہے کہ اس کی تعریف بیان کی جائے۔ اس پر نظمیں لکھی جائیں۔ کیونکہ وہ دن کا سب سے روح افزا وقت ہوتا ہے۔ بقول شاعر

اٹھی حسینۂ سحر
بہن کے سر پر تاج زر
لباس نور زیب بر
چڑھی فراز کوہ پر

جالندھری

گویا کہ حفیظ ۔۔۔ جیسے اعلیٰ شاعر نے اس دلفریب منظر پر نظم لکھی ہے۔ اس بند میں جوش نے صبح کے منظر کے بارے میں بتایا ہے کہ وہ بہترین وقت ہوتا ہے کہ مخلوق اپنے خالق کو یاد کرے۔ اس کی حمد سرائی کرے۔ اس کے حضور گڑگڑائے۔ اس سے اپنی بہتری اور بقا کے لیے دعا کرے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلام کے علاوہ باقی تمام مذاہب میں بھی صبح کی عبادت کو سب سے

زیادہ افضل سمجھا جاتا ہے۔ ہر کوئی اپنے اپنے طریقوں میں اپنے خالق کو پکارتا ہے۔ اس سے اپنا تعلق بہتر بناتا ہے۔ حفیظ جالندھری بھی اس کا بات کی طرف اپنی نظم مناظرِ سحر میں لکھا ہے

عبادتوں کے در کھلے سعادتوں کے در کھلے

یعنی صبح کا وقت انتہائی روحانیت کا وقت ہوتا ہے۔ اس وقت قدرتی مناظر اپنی خوبصورتیوں کی بلندیوں کو چھو رہے ہوتے ہیں لہذا مخلوق اپنے خالق کی خلق متأثر ہو کر اس طرف توجہ کرتی ہے۔ اس دلوں کی باتیں بتاتی ہے۔ ہر قسم کے غم سے نجات کی دعا کرتی ہے۔ اور خالق تو ہے ہی رحمٰن و رحیم وہ بھی اس وقت اپنا اپنی مخلوق پر خاص انعامات کرتا ہے۔ انھیں تازگی کا احساس دیتا ہے۔ اگر غور کیا جائے تو چرند پرند بھی صبح کے وقت خالق کی طرح بڑائی ہی کر رہے ہوتے ہیں۔ گویا تمام مخلوق اس کی بندگی میں مصروف ہوتی ہے۔ پھر شاعر ترغیب کرتے ہیں کہ اس وقت آرام کی کوئی گنجائش نہیں۔ اپنے بستر سے الگ ہو۔ اپنے خالق کے حضور پیش ہو۔ سجدوں کا رخ کرو۔ اس کی عبادت کرو۔ اپنا حالِ دل سناؤ کہ یہ ہی اس وقت سب سے مناسب کام ہے۔ اور گڑگڑا کر معافی طلب کرو۔ آنسو بہا کر اس اس کی رضا، محبت اور ہدایت کی دعا کرو۔ کہ اس وقت خدا مخلوق کے سب سے قریب تر ہوتا ہے۔ اس پہ شاعر کہتے ہیں کہ اے روح خود پرستی سے نکل اور رب کی طرف رجوع کر۔

حصہ (سوئم)

سوال نمبر 5 (صفحہ نمبر 1)

غزل کی تشریح

تشریح:

یہ غزل یہ اشعار شکیب جلالی کی تحریر کردہ غزل سے منتخب شدہ ہیں۔ شکیب جلالی دورِ جدید کے مایہ ناز شاعر ہیں۔ آپ کو زندگی میں بہت سی مشکلات کا سامنا تھا۔ بچپن سے ہی ان پر گھر کی ذمہ داری ڈال دی گئی۔ اس لیے نہ ان کا بچپن حسین یادوں سے بھرا ہے اور نہ ان کی جوانی میں کوئی دلکش داستان ہے۔ غم دوراں نے آپ کو ہر وقت نڈھال رکھا۔ اور ان کی اسی غم اور مشکلات والی زندگی کی ترجمانی ان کی شاعری بھی کرتی ہے۔

پہلے شعر میں شکیب اپنی بری قسمت کا تذکرہ کرتے ہیں کہ انھوں نے اپنے لیے اپنے گھر میں پھل دار درخت اگایا۔ اس کا خیال رکھا۔ اس کو پانی دیا اور اب جب وہ بالآخر پھل اگا چکا ہے تو ان پھلوں کی لالچ میں لوگ شکیب کے گھر سے باہر سے ان کو پتھر مارتے ہیں کہ کسی طرح وہ پھل حاصل ہو جائے۔ اس پر شکیب کہتے ہیں کہ وہ پتھر جب پھلوں کو لگتے ہیں تو پھل گر تو جاتے ہیں لیکن ان کی دیوار کے نیچے۔ ان کی نصیب میں بس وہ پتھر ہی آتے ہیں جو ان پھلوں کو گرانے کے لیے لوگ استعمال کرتے ہیں۔ یعنی شکیب انتہائی مایوسی

سوال نمبر 5 (صفحہ نمبر 2) کا شکار ہیں۔ کہتے ہیں کہ میری قسمت اتنی خراب ہے کہ مجھے اپنی محنت کا پھل بھی نصیب نہ ہوا۔ یعنی پوری زندگی تو میں نے اسی طرح کاٹی ہی ہے اور اب بھی حالات سازگار ہوتے دکھائی نہیں دیتے۔ گھر کی دیوار لوگ اسی لیے مضبوط تعمیر کرتے ہیں کہ ناگہانی آفات میں وہ انھیں طوفان و بارش سے بچائے گی۔ باہر کی دنیا سے بچائے گی۔ انسان کے لیے ایک پردے (حصے) جیسی ہوگی لیکن شکیب کہتے ہیں کہ میری تو دیوار تک نے مجھ سے وفا نہ کی۔ بقول شاعر

میری زندگی میں غم اگر اتنے تھے
دل بھی یارب کئی دیئے ہوتے

دوسرے شعر میں شکیب اپنی خودداری کا تذکرہ کرتے ہیں کہ اگر مجھے گرنا بھی ہو تو میں کسی کے سامنے جھولی پھیلاتا ہوا یا مدد کی بھیک مانگتا ہوا نہیں گروں گا۔ خود ہی اپنے قدموں میں گروں گا کہ جیسے دیوار جب گرتی ہے تو ادھر ادھر نہیں بلکہ خود اپنے سائے (کے) پر آ گرتی ہے۔ یہ سچ ہے کہ زندگی میں جن کو بے پناہ مصائب کا سامنا کرنا پڑتا ہے وہ لوگ پھر بے حس ہو جاتے ہیں۔ انھیں پرواہ ہی نہیں ہوتی کہ ان کی عزت نفس (مجروح) مجروح ہوئی ہے یا نہیں۔ یاسیت و حیاس کے مارے وہ بے چارے لبس اوروں کی مدد کے ہی منتظر رہتے ہیں۔ لیکن شکیب کہتے ہیں میں ان سب سے الگ ہوں۔ بقول غالب

حصہ (سوئم)

سوال نمبر 5 (صفحہ نمبر 3) کیوں گردش مدام سے گھبرا نہ جائے دل
انسان ہوں پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں

شکیب کہتے ہیں ان تمام حالات کے باوجود بھی مجھ میں اتنی خودداری ہے کہ میں خود تکالیف کا سامنا کروں - یعنی یہ ان کے کردار کی غیوری کی مثال ہے کہ پوری زندگی انھا حزن و یاس میں گزار کر بھی انھوں نے کبھی کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلائے -

آخری شعر میں شکیب پھر اپنی بری قسمت کو نئے انداز میں پیش کرتے ہیں - وہ ستاروں کی مثال دیتے ہوئے کہتے ہیں جس طرح وہ آسمان پر ٹمٹماتے ہوئے روشنی پھیلاتے ہیں لیکن جب انھی میں سے کوئی تارہ میرے گھر میں آ کر گرتا ہے تو تھوڑے سے اجالے کے بعد میرے غریب خانے کو اور اندھیر کر کے چلا جاتا ہے - یہ ایک فطری بات ہے کہ جب لوگوں نے پوری زندگی مشکلات میں بتائی ہو تو پھر اگر انھیں تھوڑی سی مسرت میسر آجائے تو وہ اس پر خوش ہونے کے بجائے مزید اداس ہو جاتے ہیں، کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ یہ خوشیاں ایک پل کی ہی تو ہیں - جب ختم ہوں گی تو دوبارہ معاملات دوبھر ہوتے چلے جائیں گے - لہذا شکیب بھی کہتے ہیں کہ اب تو عادت سی ہوگئی ہے کہ ٹوٹے ہوئے تارے کے گھر میں گرنے کی بھی کوئی خوشی نہیں ہوتی بلکہ وہ تاریکی میں اضافہ کر جاتے ہیں - بقول شاعر:

دور دور تک مایوسیاں محرومیاں ناکامیاں
زندگی سوز تمنا کے سوا کچھ بھی نہیں ہے

حصہ (سوئم)

سوال نمبر 6 (صفحہ نمبر 1)

درخواست نویسی

آلودگی اور گندگی کے حوالے سے درخواست

بخدمت جناب صدر یونین کونسل، علاقہ: ا، ب، ج، شہر: ا، ب، ج۔

جنابِ عالی!

مؤدبانہ گزارش ہے

کہ میں ضلع ا، ب، ج کے علاقے ع، ی، ے کا باشندہ ہوں۔ مجھے یہاں رہتے ہوئے دو سال ہو گئے ہیں۔ شروع کے دنوں میں تو مجھے اس علاقے نے بہت متاثر کیا۔ یہاں کی صاف صفائی، سکون اور معقول نظام سے میں بالکل مطمئن تھا لیکن پچھلے چھ ماہ سے حالات کچھ ناساز گار ہیں۔ خصوصاً آلودگی اور گندگی نے تو باسیوں کا جینا حرام کر دیا ہے۔ ہر طرف کوڑے کرکٹ کے ڈھیر لگے ہیں۔ بارشوں کے پانی کی وجہ سے گٹر بھی بھر آئے ہیں۔ محلے کچرا کنڈی بن گئے ہیں۔ اور اس میں پھر متعدد بیماریاں اہلِ علاقہ کو لاحق ہیں۔ اس لیے بچوں نے بھی اب گلیوں میں کھیلنا چھوڑ دیا ہے۔ گویا علاقے کی رونق ختم سی ہو گئی ہے۔ جناب! اس ساری صورتحال کے پیچھے کچھ اہم وجوہات ہیں جو آپ کی خدمت میں پیش ہیں۔ اول تو میونسپل کمیٹی کی بے ایمانی سے اہلِ علاقہ تنگ ہیں۔ ان کے کام کرنے والے محض اس دن محلوں کا رخ کرتے ہیں، صفائی کرتے ہیں کوڑا اٹھاتے جس دن انھیں معلوم ہوتا کہ آج سربراہان

حصہ (سوئم)

سوال نمبر 6 (صفحہ نمبر 2) کا چکر لگ سکتا ہے۔ باقی پورے ہفتے نہ ان کی کوئی خبر ہوتی نہ کچھ پتا ہوتا ہے۔ کوڑا اٹھانے والے گاڑی بھی ہفتے میں ایک آدھ بار ہی چکر لگاتی ہے۔ مزید یہ کہ لوگوں کو کوڑا دان نزدیکی میں میسر نہ ہونے کی وجہ سے وہ کوڑا گلی کے کونوں میں پھینک آتے ہیں جس کی وجہ سے گلی کے کونوں میں کوڑے کا ڈھیر بن جاتا ہے اور اس قدر بری بو آتی ہے کہ لوگ ماسک پہنے بغیر اس راستے سے گزر بھی نہیں سکتے۔ آخری بات یہ کہ حال ہی میں بارشوں کی وجہ سے گٹر بھر آتے ہیں ہیں۔ ان کا گندہ پانی روڈوں پر آنے کی وجہ سے لوگوں کو بے حد دشواری کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ نمازیوں کے کپڑے بھی ناپاک ہو جاتے ہیں۔ لہذا ان تمام حالات کے پیش نظر آپ سے گزارش ہے کہ حالات کی بہتری کے لیے فوراً اقدامات اٹھائے جائیں۔ میونسپل کمیٹی کی خبر لی جائے اور وہاں ایماندار افسر بھرتی کیے جائیں۔ نیز یہ کہ ہر گلی میں کم از کم تین کوڑے دان ہونے چاہییں کہ جس کی وجہ سے لوگوں کو زیادہ دور جانا نہ پڑے اور وہ با آسانی کوڑا کرکٹ پھینک دیں۔ (نیز) گٹر کی صفائی کے لیے بھی اقدامات اٹھائے جائیں۔ مجھے امید ہے کہ آپ میری اس درخواست پر غور کریں گے اور مجھ سمیت تمام اہل علاقہ کو شکریے کا موقع دیں گے۔

العارض۔

نام: ا، ب، ج شہر: ا، ب، ج

دستخط: ا، ب، ج

بتاریخ: ۱۵، مئی ۲۰۲۴ء۔

حصہ (سوئم)

سوال نمبر 7 (صفحہ نمبر 1)

مضمون نویسی

میرا پسندیدہ شاعر

کسی بھی زبان کا شاعر اس کا معمار اور نمائندہ ہوتا ہے۔ وہ اپنی منفرد انداز اور لب و لہجے میں قارئین کو اپنی زبان کی فصاحت و بلاغت سے متعارف کرواتا ہے۔ ہماری قومی اردو کے بھی بہت سے نابغہ ناز شاعر ہیں مثلاً غالبؔ، میرؔ، جانثارؔ کی جنہوں نے اپنے قلم کے ذریعے وہ کامل دکھائے کہ ہر کوئی انھیں خراجِ تحسین پیش کرتا ہے۔ لیکن ان سب شعراء میں ممتاز اور میرے پسندیدہ شاعر اور کوئی نہیں بلکہ حکیم الامت دانائے راز، نابغۂ روزگار اور شاعرِ مشرق علامہ اقبال ہیں کہ جنہوں نے اپنے قلم کے ذریعے برصغیر کے مسلمانوں کی سوتی روحوں کو اجاگر کیا اور انھیں خوابِ غفلت سے بیدار کیا۔ انھیں سمجھایا کہ مسلمان اپنی مذہبی شناخت کی بنا پر تمام اقوام سے الگ ہیں اور پاکستان کا تصور بھی آپ ہی نے دیا۔ آپ کی شاعری نہ صرف پاکستان تعریف کرتا ہے بلکہ جرمنی اور یورپ کے بیشتر ممالک میں بھی آپ کی شاعری پڑھی جاتی ہے اور اسے سراہا جاتا ہے۔

؎ اقبال کا ترانہ بانگِ درا ہے گویا
ہوتا ہے جادہ پیماں پھر کارواں ہمارا

اقبال 9 نومبر 1877 کو سیالکوٹ میں شیخ نور

سوال نمبر 7 (صفحہ نمبر 2) محمد کے ہاں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم وہیں حاصل کی۔ ۔ کالج (لاہور) سے ایف۔اے کیا۔ گورنمنٹ کالج لاہور سے بی۔اے اور ایم۔اے کیا۔ وہاں انھیں پروفیسر رولبرٹ براؤن جیسے دانا استاد سے علم سیکھنے اور استفادہ کرنے کا موقع ملا۔ اقبال کی شخصیت کو ابھارنے اور نکھارنے میں جس کا سب سے بڑا ہاتھ ہے وہ ہیں مولوی میر حسن اس لیے وہ اقبال کو اپنی زندہ تصنیف بھی کہتے ہیں۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلستان گئے اور فلاسفی میں پی۔ایچ ڈی جرمنی میونخ سے کی۔

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

اقبال کے یورپ کے دورے میں انھوں نے مغربی اقدار اور رسوم و رواج کو بہت قریب سے دیکھا اور اس کو دنیا کے لیے ہلاکت کا باعث قرار دیا۔ اقبال کی شاعری میں آفاقیت اور خصوصیت پائی جاتی ہے۔ ان کی کل شاعری مکمل تین ادوار پر مشتمل ہے۔ پہلا دور ابتدا سے لے کر (۱۹۰۵ء) تک کا ہے جس میں انھوں نے ہندوستان سے اپنی محبت کا اظہار کیا۔

سارے جہاں سے اچھا ہندوستان ہمارا

دوسرا دور (۱۹۰۵ء) سے لے کر ۱۹۰۸ تک کا ہے کہ جس میں اقبال نے مغرب کے مشاہدے کے بعد وطنیت سے اپنا رجحان ملت کی طرف بدل دیا۔ انھوں نے مسلم امت کی بکھری اور ان کو اسلامی

سوال نمبر 7 (صفحہ نمبر 3) اقرار سمجھانے کے لیے قلم اٹھایا۔ انھیں بتایا
کہ ہمارے طور طریقے عرب سے بہت الگ ہیں اور
مسلمانوں کو اپنی شناخت پہچاننے کی تلقین کی۔

اپنی ملت پہ قیاس اقوامِ مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمی

اور مزید ایک جگہ آتا ہے:

چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا
مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا

یعنی وہ مسلم امت کی یک جہتی کے خواہاں تھے۔
اور آخری دور ۱۹۰۸ء سے لے کر ۱۹۳۸ء تک کا دور وہ
تھا کہ جب انھوں نے مسلمانوں کے اندر انقلابی روح کو
بیدار کیا اور انھیں الگ وطن کا تصور دیا جس کی
بنا پر انھیں مصورِ پاکستان بھی کہا جاتا ہے۔

کی محمد سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

علامہ اقبال کی شاعری کے کچھ مخصوص
تصورات ہیں مثلاً تصورِ خودی جس میں
مسلمانوں کو خود شناسی کی تلقین کی گئی ہے۔

خودی کا سرِ نہاں لا الٰہ الا اللہ
خودی ہے تیغ فساں لا الٰہ الا اللہ

اس کے علاوہ علامہ اقبال نے شکوہ جواب شکوہ جیسی
بلند خیال اور طویل نظمیں لکھ کر پورے عالم کو
ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔

سوال نمبر 7 (صفحہ نمبر 4) کیوں مسلمانوں میں ہے دولت دنیا نایاب
تیری قدرت تو ہے جس کی نہ حد ہے نہ حساب
پھر جواب شکوہ میں کہتے ہیں۔

تھی جو اپنی قوت ہے دولتِ عثمانی ہے
تم کو اسلاف سے کیا نسبتِ روحانی ہے

اقبال نے قوم کے نوجوانوں کو قوم کا معمار اور شاہین کہا۔

نہیں تیرا نشیمن قصر سلطانی کی گنبد پر
تو شاہین ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں پر
اقبال ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ کو ہم سے رخصت ہو گئے ان کا مزار لاہور میں واقع ہے۔
اقبال کی تصانیف میں بالِ جبریل ضرب کلیم ارمغانِ حجاز جاوید نامہ، بانگ درا شامل ہیں۔ انھوں نے بچوں کے لیے بہت سی نظمیں لکھیں۔ مثلاً ماں کا خواب پہاڑ اور گلہری، بچے کی دعا۔ نیز ان کے شاعری میں ہر عمر کے لوگوں کے لیے سبق ہے۔ اقبال کی تمام خدمات پر انھیں سر کا خطاب بھی ملا۔ ان کی ان تھک محنت نے مسلمانوں کو آزاد وطن میں سانس لینے کا موقع دیا۔ اللہ ان کے درجات بلند فرمائے۔ (آمین)